© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۱۰، شمارہ ۲۰، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

حیاتِ سر سید

ڈاکٹر طاہر مسعود

Sir Syed Ahmed Khan was one of the greatest leaders who pulled the Muslims of the subcontinent out of the sordid depths to which they had fallen on political, social, educational, journalistic, linguistic, religious fronts. In a nutshell, Sir Syed made the Muslims aware of how negative influences in the name of tradition and culture had been self-inflicted by the community. He had no role model to follow, but he presented himself as a leader with the vision and competence required to rescue a nation on decline. Pakistan, without a doubt, is a result of Sir Syed's struggle in those dark years. Had it not been for him, latter-day Muslim leaders from the Quaid-e-Azam and Allama Iqbal right down to Maulana Zafar Ali Khan would have found their path

littered with potholes, it was Sir Syed who had paved the way for them. Born in Dilli, Sir Syed grew up basically under the care of his mother. After the death of his father, he joined the East India Company and saved the lives of several Englishmen in the wake of the 1857 War of Independence which was a watershed event in the life of Sir Syed who worked hard remove misunderstandings of the Masters towards their Muslim subjects. To enlighten the Muslims, he established several institutions and organizations as well as started magazine and a newspaper to enrich them with modern civilizations. And, of course, he established a college that later became the almost mythological Aligarh University, in recognition of these services, he was awarded the Sitara-e-Hind, while the University of Edinburgh conferred Doctor of Law (LLD). For his religious inclination, Sir Syed had to face accusations of being "Christaan" "Naturee" and even an atheist. In his final years, he also had to suffer from domestic worries that played heavy on his nerves. He died a somewhat dejected man on March 27, 1898.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں پر جو تباہی و بربادی آئی تھی، اس کے بعد اس بات کا عشر عشیر بھی امکان نہ تھا کہ مسلمانانِ برعظیم میں دوبارہ سر اٹھا کے چلنے کے قابل ہو سکیں گے۔ یہ سر سید احمد خاں تھے جن کے ہاتھوں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا آغاز ہوا۔ وہ انتہائی بالغ نظر، دور بیں اور مستقبل شناس انسان تھے۔ مسلمانوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کی اصلاح کی انہوں نے کوشش نہ کی ہو۔ مسلمانوں کی سیاست و معاشرت، رسم و رواج، تہذیب وتمدن، علم و ادب، تعلیم و صحافت، زبان و مذہب، غرض کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس پر انہوں نے اپنی فکر و عمل کے اثرات مرتب نہ کیے ہوں۔ وہ بے حد تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ ان کے سامنے پبلک لیڈر شپ کا کوئی نمونہ نہ تھا، لیکن انہوں نے بدلتے ہوئے حالات وضروریات کے مطابق خود کو ڈھال کر ایک ایسے لیڈر کے طور پر خود کو پیش کیا جو بجا طور پر ایک زوال آمادہ قوم کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے منتشر اور ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ریوڑ کو نہ صرف تہذیب و شائستگی اور تعلیم وتمدن سے آراستہ کیا بلکہ انہیں ایک قوم بنایا۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو قرونِ وسطیٰ سے نکال کر عہدِ جدید میں داخل کر دیا۔ ؎ ان کی پس ماندگی کو دور کر کے انہیں ترقی کی شاہ راہ پر گامزن کیا۔

آج کا پاکستان سرسید احمد خاں ہی کی جد و جہد کا ثمر ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اگر وہ میدانِ عمل میں نہ کودتے تو قائد اعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابو الکلام آزاد، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے رہنماؤں کے ابھرنے کا راستہ ہموار نہ ہوتا۔ سرسید نے جو کنواں کھودا تھا اس سے مسلمانوں کے ہر طبقے نے اپنی پیاس بجھائی۔ انہوں نے جو بیج بویا تھا، آج اسی کے درخت کا پھل ہم سب کھا رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی احسان مندی اور شکر گزاری کے جو تقاضے تھے وہ ہم سے پورے نہ ہوئے اور آج بھی ایک طبقہ ان کا اسی طرح نکتہ چیں ہے جیسا ان کی زندگی میں تھا۔ اس کے باوجود بہ قول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی:

> ”دنیا انہیں بہت عرصے تک ایک مورخ کی حیثیت سے جس نے متون کی تہذیب وترتیب اور آثار کی تحقیق و تفتیش کی، ایک مصنف کی حیثیت سے جس نے اردو نثر کو تصنع کی زنجیروں سے آزاد کیا اور اس میں صاف و شفاف پانی کی طرح قدرتی روانی پیدا کی، ایک مذہبی مفکر کی حیثیت سے جس نے اسلام کی ایسی تفسیر کی بنیاد ڈالی جو عہدِ حاضر کے ذہن

> کیلئے موزوں ہے، ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے جو اپنی ملت کی تعلیمی ضروریات کے متعلق صفائی سے سوچ سکتا تھا، ایک سماجی مصلح کی حیثیت سے، ایک پُر جوش انسان دوست کی حیثیت سے اور انصاف و صداقت کے لیے ایک بے خوف نبرد آزما کی حیثیت سے یاد رکھے گی۔“ ؎

حالاتِ زندگی:

سرسید نے ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں۔ اور ان کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ جس زمانے میں بنی فاطمہ کے سادات خاندانوں کا بنی اُمیہ اور بنی عباس کے ظلم وستم کے سبب عرب اور عراق میں رہنا مشکل بنا دیا گیا تھا، اسی دور پُر آشوب میں سرسید کے آباؤ اجداد نے ایران کے قدیم شہر و اسفان کی طرف ہجرت کی تھی اور بالآخر ہرات میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں غالباً پہلی بار مغل بادشاہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں آئے تھے، اور تب سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک سرسید کے خاندان کا دربار مغلیہ سے تعلق رہا تھا۔ ؎ اور مختلف وقتوں میں ان کے بزرگوں کو دربار سے خطاب بھی ملتے رہے تھے۔ سرسید کا خاندان شعر و ادب سے بھی علاقہ رکھتا تھا۔ ان کے دادا سید ہادی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا دیوان سرسید کے پاس محفوظ تھا، جو جنگِ آزادی میں تلف ہو گیا۔ سید ہادی کے بیٹے اور سرسید کے والد میر متقی درویش صفت انسان تھے۔ گو ان کا اثر و رسوخ دربار میں بھی تھا لیکن انہیں دنیاوی معاملات سے دلچسپی برائے نام تھی۔ وہ آزادی اور بے فکری سے زندگی گزارنے کے قائل تھے جس کی وجہ سے سرسید کی تربیت وتعلیم کی ساری ذمہ داری ان کی دور اندیش اور سلیقہ مند والدہ پر آپڑی تھی۔ ان کی والدہ بھی ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد یعنی سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین نہایت لائق، دانش مند اور صاحب علم و فضل تھے۔ ریاضی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اور اس بارے میں انہوں نے چھوٹے رسالے بھی تصنیف کیے تھے۔ خواجہ فرید الدین کو گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ایران میں سفارت کاری کے لیے بھی بھیجا تھا۔ دوسری طرف مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کا بھی خطاب دے کر عہدۂ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزارت پہ مامور کیا تھا۔ ؎ سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اولاد کی تربیت کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔

سرسید کی تعلیم وتربیت:

سرسید کی تربیت کس کڑی نگرانی میں ہوئی تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے، جب انہوں نے نوعمری میں ایک بوڑھے ملازم کو تھپڑ مار دیا تھا اور ان کی والدہ نے غضب ناک ہوکر انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اس وقت تک معاف نہیں کیا تھا جب تک انہوں نے بوڑھے ملازم سے اپنی تقصیر کی معافی نہیں طلب کر لی تھی۔ ؎ سرسید کی تربیت کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب سرسید برسرِ روزگار ہو گئے تھے۔ ☆

سرسید کے والد میر متقی دلی کے صوفی بزرگ اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علیؒ اور والدہ شاہ عبد العزیزؒ سے بیعت تھیں۔ (سرسید کا نام احمد اور ان کے بڑے بھائی کا نام محمد شاہ غلام علی نے رکھا تھا۔) والدہ بہت صحیح العقیدہ خاتون تھیں۔ وہ کوئی ایسا عقیدہ نہیں رکھتی تھیں جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے۔

سرسید کی ایک بہن صفیۃ النسا بیگم اور ایک بھائی سید محمد خاں تھے۔ بہن نے تو نوے سال کی عمر پائی لیکن بھائی کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ سرسید کو ان سے بہت محبت اور لگاؤ تھا۔ بلکہ دلی میں دونوں بھائیوں کی الفت ومحبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ سرسید اپنے خاندان کے اکثر بچوں کے مقابلے میں نہایت تندرست وتوانا تھے۔ جب وہ پیدا ہوئے تھے تو ان کے نانا خواجہ فرید الدین نے انہیں دیکھ کر یہ تبصرہ کیا کہ "یہ تو ہمارے گھر جاٹ پیدا ہوا ہے۔" حالی لکھتے ہیں: "سرسید میں جسمانی صحت کے سوا کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے انہیں دوسرے بچوں پہ فوقیت دی جا سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور وفکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اس لیے ان کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ چمکدار معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جس قدر آگے بڑھتے جایئے، اسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔" ؎

سرسید کو ان کے خاندان کی قدیم ملازمہ مسماۃ ماں بی بی نے پالا تھا۔ اس لیے ان کو

ماں بی بی سے بہت انسیت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ان کا انتقال ہوا۔ ان کی موت کا سرسید کو بہت صدمہ ہوا۔ والدہ نے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں۔ تم کچھ رنج مت کرو۔ سرسید کہتے ہیں کہ مجھ کو پورا یقین تھا کہ واقعتاً ایسا ہی ہے۔ ماں بی بی نے مرتے ہوئے اپنا سارا زیور سرسید کے نام کر دیا تھا۔ ایک دن والدہ نے سرسید سے پوچھا کہ کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں اور پھر ان کا جواب اثبات میں پاکر سارے گہنے خیرات کر دیئے۔ ؎

بچپن میں سرسید پر کھیلنے کودنے پر نہ بہت پابندی تھی اور نہ اتنی آزادی کہ جس کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ چونکہ ان کے خاندان میں چودہ پندرہ بچے رشتہ داروں کے پہلے سے موجود تھے، جو ان کے ہم عمر تھے اور جو کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے ان کو نوکروں کے بچوں اور شرفاء کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ گھر کے بڑوں کی ہدایت تھی کہ کوئی کھیل چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب بڑوں کے سامنے ہی کھیلتے تھے۔ سرسید کا بیان تھا: "باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔" ؎ اسی پابندی کی وجہ سے سرسید کو بری صحبت میں اٹھنے بیٹھنے یا آوارہ گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا۔

سرسید اپنے بچپن میں بہت مستعد، چالاک اور شوخ بھی تھے۔ ان کی شرارتوں کے دو ایک واقعات حالی نے "حیاتِ جاوید" میں درج کیے ہیں۔ وہ بچپن میں اکثر گیند، بلا، کبڈی، آنکھ مچولی، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ ذرا بڑے ہوئے تو والد سے تیراکی اور تیر اندازی سیکھی۔

مقدس دینی شخصیات کی عظمت کا خیال سرسید کے دل میں بچپن ہی سے بٹھایا گیا تھا۔ والد صاحب میر متقی انہیں اکثر اپنے ساتھ لے کر شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ سرسید لکھتے ہیں:

> "آپ کی (شاہ غلام علیؒ کی) میرے خاندان پر اس قدر شفقت ومحبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے......میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ شفقت ومحبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمیز تو ہوتی نہیں، خصوصاً صغر سن میں، جو چاہتا سو کہتا اور جو چاہتا سو کرتا
اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا
فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو دیکھا نہیں۔ آپ ہی کو دادا حضرت کہا
کرتا تھا۔ شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسے حقیقی دادا
کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا
اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے
آزاد کر رکھا ہے لیکن متعلق کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے
بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔" ١٠

ہر چند کہ حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کے بچپن میں ان کی جسمانی صحت کے سوا کوئی بات ایسی نہ تھی کہ انھیں دوسرے بچوں پر فوقیت دی جا سکے لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ سرسید میں ذہانت اور سچائی کا مادہ بچپن ہی سے تھا۔ مثلاً حالی ہی کا بیان ہے کہ سرسید والد کے ہم راہ دربار میں جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تاخیر سے دربار پہنچے تو دربار برخواست ہو چکا تھا۔ بادشاہ اکبر شاہ نے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر فرمایا: "دیر کیوں کی؟" حاضرین نے کہا "عرض کرو۔ تقصیر ہوئی۔" لیکن سرسید چپکے کھڑے رہے۔ جب بادشاہ نے دوبارہ پوچھا تو سچائی سے جواب دیا: "سو گیا تھا۔" بادشاہ مسکرائے اور فرمایا: "بہت سویرے اٹھا کرو۔" اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ ١١

دوسرا واقعہ جسے خود سرسید نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ جنرل اکٹر لونی جو خواجہ فرید الدین کے دوست تھے، ان کے گھر آئے۔ جنرل صاحب نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ سرسید کی عمر پانچ چھ برس کی ہوگی۔ انھوں نے جنرل سے پوچھا: "آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دو بڑے بٹن کیوں لگائے ہیں؟" جنرل صاحب اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ ١٢ ان سوالوں سے سرسید کی ذہانت ظاہر ہوتی ہے۔

سرسید کی رسم بسم اللہ حضرت شاہ غلام علیؒ نے کرائی۔ اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے سرسید بتاتے ہیں: "مجھ کو اپنی رسم بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علیؒ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا: پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔" مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر پڑھیں گے اور اول بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھتا گیا۔" ١٣

رسم بسم اللہ کے بعد سرسید نے قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں ایک استانی نوکر تھیں۔ سرسید نے ان ہی استانی سے سارا قرآن ناظرہ پڑھا۔ پھر والدہ سے جو فارسی کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں، ان سے "گلستاں" کے چند سبق پڑھے۔ علاوہ ازیں اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے۔ ١٤

جبکہ "بوستاں" کے اسباق نانا خواجہ فرید الدین سے لیے ١٥ مولوی حمید الدین ایک لائق بزرگ ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے، ان سے کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول ما انا قلت تک پڑھی لیکن جو کچھ پڑھا نہایت بے پروائی اور بے توجہی سے پڑھا۔ اس کے بعد ان کو ریاضی پڑھنے کا شوق چرایا۔ انہوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خان سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے اور دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر طب سے دل چسپی پیدا ہوئی تو حکیم غلام حیدر خان سے طب کی ابتدائی کتابوں کے درس لیے۔ چند ماہ حکیم صاحب کے مطب میں بھی بیٹھے پھر تعلیم ترک کر دی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس تھی۔

سرسید کی نوجوانی نہایت رنگین گذری۔ وہ اپنے ماموں نواب زین العابدین کے ہم راہ راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں طوائفیں دھرپت و خیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں۔ ١٦، حالی نے لکھا ہے کہ اگرچہ سرسید کی سترہ اٹھارہ برس میں شادی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ان محفلوں سے خود کو نہ بچا سکے۔ لیکن پھر سرسید کا دل ان رنگ و نور کی محفلوں سے اچاٹ ہو گیا۔ اس بے رغبتی میں دیگر اسباب کے علاوہ جس چیز نے اہم کردار کیا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال تھا۔ بھائی کے مرتے ہی ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ عمدہ لباس پہننا یک دم ترک کر دیا، سر گھٹوا لیا، داڑھی چھوڑ دی، پائنچے ٹخنوں سے اوپر کر لیے، کرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا کم کر دیا اور بالکل مولوی ہو گئے۔

سرسید نے خود بھی اپنی ایک تحریر میں نوجوانی کی اس لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے:

> "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے، جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے اور اپنی قوم کے غم خوار" ۲۰

روزگار کا سلسلہ:

۱۸۳۸ء میں سرسید کی عمر جب تقریباً بائیس سال تھی۔ ان کے والد میر متقی کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد روزگار کا سارا بوجھ سرسید پہ آ پڑا۔ کیونکہ والد کو قلعہ سے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ بند ہو گئی۔ سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کا ارادہ کیا۔ ہر چند کے ان کے رشتہ دار قلعہ معلیٰ سے تعلق توڑنے پر راضی نہ تھے۔ لیکن سرسید اپنی دھن کے پکے تھے، اپنے ارادے پر قائم رہے۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ ان سے کچہری میں کام سیکھنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر سرسید نے کام سیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ سرسید اس وقت عدالت کی کاروائیوں اور انگریزی قوانین سے بے بہرہ تھے۔ چند ماہ بعد مولوی خلیل اللہ خاں نے انہیں کچہری میں سر رشتہ دار مقرر کر دیا۔ کچھ مدت بعد مسٹر رابرٹ ہملٹن جو سرسید کو پہلے سے جانتے تھے، دلی میں جج ہو کر آئے۔ انھوں نے سرسید کو سیشن عدالت کا سر رشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن سرسید نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ جس کام کی میں اپنے اندر لیاقت نہیں پاتا، اسے کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ ۲۱

پھر مسٹر رابرٹ ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہوئے تو انہوں نے سرسید کو آگرہ بلا کر کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدے پر فائز کر دیا۔ یہ فروری ۱۸۳۹ء کا واقعہ ہے۔ یہاں سرسید نے جلد ہی قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔

سرسید ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف ہو گئے۔ اس کے تقریباً دو سال بعد ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہو گیا۔ اس وقت تک سرسید متعدد کتابیں تصنیف کر چکے تھے۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ نے سرسید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ خطاب تھا جو اد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ ہے۔۲۲

از سرِ نو تعلیم کا شوق:

۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید کا تبادلہ فتح پور سیکری سے دلی ہو گیا۔ یہاں آ کر ان میں از سر نو مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے، ان سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ مولوی فیض الحسن سے مقاماتِ حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولوی مخصوص اللہ جو شاہ عبد العزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدینؒ کے بیٹے تھے، حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ، جامع ترمذی اور کچھ حصہ صحیح مسلم کا ان سے پڑھا اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید نے خود اعتراف کیا ہے، کسی استاد سے انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ ۲۳

سرسید کا تبادلہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو دلی سے بجنور ہو گیا۔ اب وہ مستقل صدر امین مقرر ہوئے تھے۔ بجنور میں سوا دو برس گذرے تھے کہ جنگ آزادی جسے سرسید غدر کا نام دیتے تھے، چھڑ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور سرسید:

حالی لکھتے ہیں کہ سرسید کے خیالات میں انقلاب غدر کے بعد آیا۔ اس وقت وہ بجنور میں تھے۔ بیس انگریز عورتوں اور بچوں سمیت مقیم تھے۔ سرسید نے نہایت ہمت و جواں مردی سے ان لوگوں کی حفاظت کی بلکہ ان کی حفاظت کے لیے جان کا خطرہ مول لیا۔ سرسید کی حسن تدبیر سے انگریز عورتیں اور بچے بہ حفاظت بجنور سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاف لڑنے والے مجاہدوں کے سردار نواب محمود خاں سے اس مقصد کے لیے انہوں نے مذاکرات کیے، اسے سمجھایا بجھایا اور بالآخر اسے قائل کر لیا کہ انگریز خاندانوں کو یہاں سے جانے دیا جائے۔ سرسید نے اس خطرناک موقع پر بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں نواب محمود خاں کو جتلا دیا کہ:

"میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں۔"

انہوں نے محمود خاں سے یہ بھی کہا کہ:

"انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عمل داری نہ کر سکے گا۔" ۴۱

یہ سچ ہے کہ سرسید ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو جہاد نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ شرع کے بموجب یہ ہرگز جہاد نہیں ہے۔ ۴۲

سرسید بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچے تو حال یہ تھا کہ جیب میں صرف چھ پیسے اور بدن پر ایک پھٹے ہوئے کرتے کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرسید نے پانچ مہینے تک میرٹھ میں قیام کیا۔ وہیں انہیں یہ دل خراش خبر ملی کہ دلی میں سرکاری فوج نے ان کا گھر اور تمام سامان و اسباب لوٹ لیا ہے۔ سرسید دلی پہنچے تو والدہ کو تین دن سے فاقے میں پایا۔ وہ والدہ کو لے کر میرٹھ آئے جہاں کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ۴۳

۱۲ فروری ۱۸۵۸ء کو سرسید شکسپیئر کے ہمراہ بجنور پہنچے۔ وہاں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم تھا۔ سرسید نے "بغاوت" میں حصہ لینے والوں کی داد رسی تو نہیں کی البتہ جو لوگ کسی مصلحت، مجبوری یا دباؤ کی وجہ سے "باغیوں" سے مل گئے تھے، سرسید نے جہاں تک ہو سکا انہیں انگریزوں کے جذبۂ انتقام سے بچایا۔ سرسید نے بعد میں "تاریخ سرکشی بجنور" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں انہوں نے سارے حالات قلم بند کیے۔

اپریل ۱۸۵۸ء کو سرسید مراد آباد منتقل ہو گئے۔ انہیں انگریز حکومت نے صدر الصدور کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ اگلے برس "غدر" کے واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بیٹھا تو سرسید واحد مقامی ممبر تھے۔ دو برس تک کمیشن تحقیقات کرتا رہا۔ حالی لکھتے ہیں کہ مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے کہ کمیشن میں سرسید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غداریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائیدادیں جس قدر ضلع مراد آباد میں واگزاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔ ۴۴

خدمات کا صلہ:

سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم میں انگریزوں کی جانیں بچانے کی جو خدمت انجام دی، اس کے صلے میں انگریز سرکار نے انہیں بھاری جائیداد دینی چاہی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کے ایجوکیشنل کانفرنس میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے کہا:

> "جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔" ۴۵

سرسید کی خدمات کا اجمالی جائزہ:

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جو تباہی و بربادی ہوئی، اس نے سرسید کو مایوسی اور دل شکستگی سے دو چار کر دیا اور انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ بقول خود ان کے:

"میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔"

مگر پھر اس خیال سے کہ "نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی اوّلاً فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" ۳۶؎

سر سید نے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں جہاں کوئی مدرسہ نہ تھا، ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ ۳۷؎ ، انہی دنوں انہوں نے حکومت کو اپنی ایک تفصیلی تحریر میں ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔

مراد آباد ہی میں انہوں نے یہ دیکھ کر کہ انگریزوں کا سارا غیظ و غضب مسلمانوں پر نازل ہو رہا ہے، "اسباب بغاوت ہند" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کیا اور اسے شائع کرا کے انگلستان میں پارلیمنٹ کے اراکین کو ارسال کیا۔ سر سید یہ رسالہ لکھ ہی رہے تھے کہ ملکۂ برطانیہ کی جانب سے "باغیوں" کی معافی کا اشتہار شائع ہوا۔ سر سید نے ملکۂ معظمہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء کو مراد آباد میں ایک جلسہ کیا جس میں پندرہ ہزار افراد شریک ہوئے۔ نماز کے بعد سر سید نے مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر اردو میں ایک نہایت پُر اثر مناجات پڑھی۔ ۳۸؎

انگریزوں کے دل سے یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ "بغاوت" کے سراسر ذمہ دار مسلمان ہیں۔ سر سید نے ۱۸۶۰ء میں ایک رسالہ بہ موسوم "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالا۔ اس رسالے میں انہوں نے اس بات کی شہادت فراہم کی کہ "بغاوت" کے دوران انگریزوں سے وفاداری اور جانثاری کا جیسا مظاہرہ مسلمانوں نے پیش کیا، کسی اور قوم نے نہیں کیا۔ اس رسالے کے صرف تین نمبر شائع ہو سکے۔ ۳۹؎

اس زمانے میں انگریز حکومت عیسائیوں کو نصاریٰ کہنے پر سخت برافروختہ ہوتی تھی اور نصاریٰ لکھنے والوں کو پھانسی کے تختے تک پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ سر سید نے انگریز حکومت کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے ایک مختصر رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" لکھا اور اسے اردو اور انگریزی میں چھپوا کر تقسیم کیا۔ اس رسالے میں سر سید نے ثابت کیا کہ عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خود کو نصاریٰ کہتے تھے۔ اس رسالے کی اشاعت کا فائدہ یہ ہوا کہ پھر کسی کو اس "

جرم" پر سزا نہیں دی گئی۔ ۴۰؎

۱۸۶۰ء میں جب سر سید مراد آباد میں صدر الصدور تھے، اضلاع شمال مغرب میں ایک زبردست قحط پڑا۔ کلکٹر سر جان اسٹریچی نے ضلع کے قحط کا انتظام سر سید کے سپرد کر دیا۔ سر سید نے اس موقع پر اپنے اعلیٰ منتظم ہونے کا ثبوت دیا۔ ۴۱؎

۱۸۶۱ء میں مراد آباد ہی میں سر سید کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ سر سید کی عمر چوالیس برس تھی۔ دوستوں نے دوسری شادی کے لیے بہت اصرار کیا لیکن انہوں نے کچھ بچوں اور بہت کچھ قوم کی خدمت کرنے کے جذبے کی وجہ سے اس تجویز پر صاد نہیں کیا۔ ۴۲؎

۱۸۶۳ء میں سر سید کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ اس وقت تک سر سید اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم کی روشنی نہیں پھیلے گی، ان کی حالت میں انقلاب برپا نہیں ہوگا۔ ہندوستانیوں کو جدید علوم سے واقف کرانے اور انگریزی زبان سے ان کی بیزاری کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اسی سال سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی۔ ۴۳؎ اگلے برس انہوں نے غازی پور میں مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ قومی چندے سے قائم کیا گیا تھا۔

۱۸۶۴ء میں سر سید علی گڑھ آئے۔ سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر بھی یہیں منتقل ہو گیا۔ ۱۰

مئی ۱۸۶۶ء کو سر سید نے ہندوستان کے مسائل و معاملات کو برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچانے کے لیے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ ۴۴؎، اسی سال انہوں نے اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کرنے کی تحریک کی جس کا مقصد تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے مقامی لوگوں کی شمولیت تھی۔ ۴۵؎، ۱۸۶۶ء ہی میں سر سید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا، جو ان کی موت کے بعد بھی جاری رہا۔ ۴۶؎

۵ اگست ۱۸۶۷ء کو سر سید علی گڑھ سے تبادلہ ہو کر بنارس چلے گئے۔ وہ وہاں جولائی ۱۸۷۶ء تک رہے۔ بنارس میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے ۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو ہومیو پیتھی کا شفاخانہ کھولا۔ پہلے ہی مہینے میں پانچ سو سولہ مریض شفاخانے میں علاج کی غرض سے آئے۔ ۴۷؎، یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ واپسی پہ انہوں نے "ٹیٹلر" اور "اسپیکٹیٹر" کی طرز پہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجراء کیا۔ رسالے کا پہلا شمارہ ۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دسمبر ۱۸۷۰ء کو منظر عام پر آ گیا۔ اسی سال انہوں نے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کھولا جائے۔ [۸] ۸ جولائی ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں علی گڑھ کالج کا افتتاح ہوا۔

۱۸۷۸ء میں سر سید کو لارڈ لٹن نے وائسریگل قانون ساز اسمبلی کا ممبر مقرر کیا۔ ۱۸۸۳ء انھوں نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ عام ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے یورپ کے سفر پہ آمادہ کیا جائے۔ اور چندے سے ایک فنڈ قائم کر کے یورپ جانے والے طلباء کی امداد کی جائے۔ اسی سال انھوں نے ضلع علی گڑھ کے رئیسوں کے تعاون سے علی گڑھ محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ [۹]

۱۸۸۶ء میں سر سید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر علی گڑھ کالج بن بھی گیا تو بھی یہ کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کانفرنس کے ذریعے ملک بھر میں تعلیمی بیداری پیدا کی جائے۔ اور مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو پھیلایا جائے۔ [۱۰]

اگلے سال ۱۸۸۷ء میں سر سید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کا ممبر بنا دیا۔ سر سید نے انگریزی نہ جاننے کے باوجود اپنے فرائض عمدگی سے انجام دیے۔ [۱۱]

انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو سر سید نے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا اور حکومت اور انگلستان کے اراکین پارلیمنٹ سے رابطے کے لیے اگست ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی [۱۲]، اسی سال انہیں نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلیٰ ستارۂ ہند کا اعزاز ملا۔ اگلے سال ان کی علمی خدمات پر ایڈنبرا کی ایک مشہور یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری عطا کی۔ [۱۳]

سر سید جنھیں ان کے مذہبی عقائد کی وجہ سے کرستان، نیچری اور کافر تک کا بہتان سہنا پڑا تھا، آخری عمر میں انہیں یہ صدمہ پہنچا کہ ایک ہندو کلرک نے جسے انہوں نے کالج کا خزانچی مقرر کر رکھا تھا، کالج کے حسابات میں سے ایک لاکھ روپے کا غبن کیا۔ یہ روپیہ اس کے پکڑے جانے کے باوجود وصول نہ ہو سکا۔ آخری دنوں میں انہیں خاصے خانگی تفکرات نے مضمحل کر دیا

تھا، جو ان کے مشہور بیٹے سید محمود کی بیماری سے پیدا ہو گئے تھے۔ [۱۴] چنانچہ اسی سال کی عمر میں یہ بطل جلیل ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو بہ مقام علی گڑھ رحلت کر گیا۔ [۱۵]

حوالہ جات:

۱۔ شجاع احمد زیبا" مولوی نذیر احمد اور علی گڑھ تحریک" مکتبۂ اسلوب کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۷۔

۲۔ اشتیاق حسین قریشی، "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء، مترجم: ہلال احمد زبیری، ص ۳۲۵۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۲۶

۴۔ الطاف حسین حالی" حیات جاوید" جلد اول، ہمسا لک، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۸۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۹۴

۶۔ ایضاً، ص ۹۹

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۰۔ ضیاء الدین لاہوری، "خود نوشت حیات سر سید" جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵

۱۱۔ الطاف حسین حالی محولہ بالا، ص ۱۰۷

۱۲۔ ضیاء الدین لاہوری محولہ بالا، ص ۵۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۷۔ الطاف حسین حالی محولہ بالا، ص ۱۱۲۔۱۱۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۲۲۔ ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

التفسیر سرسید احمد خان

۲۳_ایضاً، ص ۱۳۷

۲۴_ایضاً، ص ۱۴۲

۲۵_ایضاً، ص ۱۴۱

۲۶_ایضاً، ص ۱۴۱_۱۴۲

۲۷_ایضاً، ص ۱۴۲

۲۸_ایضاً، ص ۱۵۱

۲۹_ثریا حسین ''سر سید احمد خاں اور ان کا عہد'' ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰۶

۳۰_الطاف حسین حالی، محولہ بالا ص ۱۶۲

۳۱_ایضاً، ص ۱۶۳

۳۲_ایضاً، ص ۱۷۶

۳۳_ایضاً، ص ۱۷۶_۱۷۷

۳۴_ایضاً، ص ۱۸۴

۳۵_ایضاً، ص ۱۸۳

۳۶_ایضاً، ص ۱۸۴

۳۷_ایضاً، ص ۱۹۴

۳۸_ایضاً، ص ۲۲۴

۳۹_ایضاً، ص ۲۹۳_۲۹۴

۴۰_ایضاً

۴۱_ایضاً، ص ۳۰۱

۴۲_ایضاً، ص ۳۱۰

۴۳_ایضاً، ص ۳۴۰

۴۴_اشتیاق حسین قریشی، محولہ بالا، ص ۳۳۵

۴۵_الطاف حسین حالی، محولہ بالا، ص ۲۳۶_۲۴۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

خواجہ غلام فرید آف کوٹ مٹھن شریف اور ان کے منتخب علمی آثار

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

Khawaja Ghulam Farid of Kot Mittahan Sharif is well-known as a great sufi, scholar, and a linguistic poet. His mother tongue was siraiki. Apart from siraiki his published works and books of poems are also in urdu and persian, for those explicated commentaries has been written. He was the author of several scholarly books. On them the pronouncements were written, presented to him in his presence and afterwards they were published as well. This anthology has been titled as Maqabees-ul-Majalis. He possessed the mastery over several sciences and skills. However, in this article his scholarly testimonials are selected which are related to Quran.

خواجہ غلام فرید آف کوٹ مٹھن شریف ۲۳ ذوالحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۲۳، دسمبر ۱۸۴۵ء بروز منگل قبل از طلوع آفتاب ،ساعت مشتری میں اپنے وقت کے جید عالم اور معروف صوفی بزرگ خواجہ خدا بخشؒ المعروف محبوب الٰہی کے گھر تولد ہوئے، ان کا تاریخی نام خورشید عالم (۱۲۶۱ھ) رکھا گیا، جبکہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے سلسلۂ نسبت کے باعث ان کا نام غلام فرید تجویز کیا گیا اور پھر اسی نام سے آپ نے شہرت پائی۔(۱)

خواجہ غلام فریدؒ کی شہرت تو ہفت زبان شاعر کی حیثیت سے ہے، ان کے تین دیوان، سرائیکی، اردو، فارسی مطبوعہ ہیں جب کہ نثر میں مناقب فریدیہ، مناقب محبوبیہ، فوائد فریدیہ اور رسالہ مسالک فریدی بھی مطبوعہ ہیں، آپ کے ملفوظات اشارات فریدی (فارسی) بھی طبع ہوئے تھے جن کا ترجمہ مقابیس المجالس کے نام سے موجود ہے، خواجہ فرید نے اپنے سرائیکی دیوان کی کافیوں کی ترتیب احادیث شریفہ سے اسماء الرجال کی طرز پر خود فرمائی تھی جیسا کہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

> ''ایں ترتیب ردیفات در دیوان کافیات خود کہ نہادہ ام از احادیث شریفہ وسوق وترتیب اسماء الرجال اخذ کردہ ام، اگر کروڑہا کافی تصنیف شود ایں ترتیب تمام نخواہد شد) ترجمہ: اپنے دیوان میں کافیوں کی ترتیب احادیث شریفہ اور اسماء الرجال کی ترتیب سے اخذ کرکے میں نے خود دی ہے اگر کروڑہا کافیاں لکھی جائیں پھر بھی یہ ترتیب ختم نہ ہوگی''(۲)

خواجہ غلام فرید نے آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا، وہ خداداد قوت حافظہ کے مالک تھے، بچپن میں ہی ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ قرآن مجید کے چار چار رکوع روزانہ یاد کرکے استاد کو سناتے تھے، اور پھر ایک دن خود ہی اپنی یادداشت وحافظے کا امتحان اس طرح لیا کہ ایک حافظ صاحب سے کہا کہ آج میں ایک پارہ یاد کرکے سناؤں گا اور پھر واقعی ڈھائی گھنٹے میں یاد کرکے سنادیا اور ایک غلطی بھی نہ نکلی۔(۳)

اسی طرح آج سے ۸۰ سال پہلے علامہ نسیم طالوت (ڈیروی) دیوان فرید پر اپنے طویل ترین مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ''خواجہ فرید دو گھنٹے میں مولوی لطف علی کی تصنیف ''سیف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلوک'' کا ایک جز یاد کر لیتے تھے''(۴)

خواجہ غلام فرید نے مسند سجادگی (۱۲۸۸ھ) سنبھالتے ہی مسند تدریس بھی سنبھال لی، مقابیس المجالس کے مختلف مقبوسوں سے اخذ کر کے ماہر فریدیات علامہ سعیدی نے لکھا ہے کہ خواجہ فرید نحو، معانی وبدیع، فقہ، میراث، کلام، حدیث وتفسیر کی منتہی کتب خود پڑھاتے تھے اور جن کتب کے نام مقابیس سے ملے ہیں وہ یہ ہیں، شرح ملا جامی، شرح چغمینی، مطول، مختصر المعانی، شرح عقائد نسفی، ہدایہ، میراث میں سراجی اور تصوف میں ست مراتب، تحفہ مرسلہ، لوائح جامی، فصوص الحکم اور حدیث میں ترمذی اور مشکوۃ شریف وغیرہ۔(۵)

خواجہ غلام فرید اگرچہ روایتی مدرسے سے پڑھے ہوئے تھے مگر انہیں تاریخ، جغرافیہ اور متعدد سائنسی علوم پر بھی دسترس حاصل تھی اور ان کے ملفوظات اس کی گواہی دے رہے ہیں، نیز ان کی علمی شان بیان کرتے ہوئے علامہ سعیدی لکھتے ہیں، خواجہ فرید کے ملفوظات عرف عام کے روایتی ملفوظات سے قطعاً جداگانہ ہیں، اگر ان ملفوظات کو علوم میں تقسیم کیا جائے یعنی کونسا مقبوس کس علم سے متعلق ہے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ خواجہ فرید ۴۵ علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے (موصوف نے ان علوم کی فہرست بھی دی ہے) یعنی ہر مقبوس کسی نہ کسی علم کی نمائندگی کرتا ہے، ملفوظات کے مطالعہ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ علم کی ریاست کے شہنشاہ تھے، یہی وجہ ہے کہ وقت کے نابغہ روزگار علماء وفضلاء ان کی مجلس درس میں شاگرد بن کر بیٹھتے تھے، بیشک وہ اپنے وقت کے مجتہد بلکہ مجدد تھے۔(۶)

خواجہ فرید کے عالمانہ تفوق کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس سید محمد نواز شاہ کی تحریک (رولنگ) پر جون ۱۸۸۹ء مطابق ۳ شوال ۱۳۰۶ھ کو نواب آف بہاولپور کے محل کے ایک حصے میں ایک علمی مناظرہ (علم العقائد پر) کرایا گیا، جس میں ہندوستان سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ ایک فریق کی حیثیت سے جبکہ مقامی علماء میں مولانا غلام دستگیر اور مولانا سلطان محمود دوسرے فریق کی حیثیت سے شریک تھے یعنی دونوں طرف سے جبال العلم شخصیات شریک مناظرہ تھیں، اس مناظرہ میں بطور منصف وحکم جس شخصیت کا طرفین سے متفقہ انتخاب ہوا وہ شخصیت خواجہ غلام فرید کی تھی۔(۷)

مقابیس المجالس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ غلام فرید نے متعدد معروف ومعتبر کتب کے بعض مندرجات کو عقلاً ونقلاً غلط ثابت کیا ہے، مثال کے طور پر وہ مولانا عبدالحی لکھنوی کے مجموعہ فتاوی کے بعض فتووں کو بھی قلم کی زد میں لائے ہیں، مثلاً وہ فتویٰ جو حضرت ابن عباس کے ایک قول (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ مثل) کے حوالے سے ہے خواجہ فرید نے اسے قرآن کریم، طبیعیات اور جغرافیہ کی مدد سے مرجوح قرار دیا ہے، پھر ارباب ملت اور ارباب نحل (ارباب مذہب وارباب فلسفہ) میں تفریق کر کے دونوں کے فکری، نظریاتی مآخذ ومراجع میں بعد المشرقین ثابت کیا ہے، یعنی بطلیموس اور فیثا غورث کے فلکیاتی اور جیالوجیکل نظریات میں فرق کو بھی واضح کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اہل ملت کے مآخذ میں بہت سی اشیاء کا ذکر موجود ہے اور ان کے وجود پر اہل ملت کو اقرار بھی ہے لیکن اہل نحل ان چیزوں کے وجود کے قائل نہیں ہیں جیسے جبل کوہ قاف، سد سکندری، یاجوج وماجوج، چشمہ آب حیات وغیرہ، مگر اہل ملت ان کے قائل ہیں، اگرچہ نہ مشاہدہ میں ہیں اور نہ عالم ناسوت سے متعلق ہیں۔ پھر قول ابن عباس میں ''فی کل ارض'' سے کیا مراد ہے، ارباب نحل تو صرف ایک زمین کے قائل ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ قطعات (سات براعظم) کے اعتبار سے سات زمینیں ہیں تو پھر ان قطعات میں پہلے پیغمبروں کی بعثت کو ثابت کرنا پڑے گا، اگر ''ولکل قوم ھاد''(الرعد/۷) کے مطابق وہاں پیغمبر مبعوث ہوئے بھی ہوں جیسا کہ خیال ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام ریڈ انڈینز کے نبی تھے، تو بھی آنحضرت ﷺ کے عہد میں کسی پیغمبر کی بعثت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آنحضرت کا ام القریٰ یعنی دنیا بلکہ کائنات کے وسط ومرکز میں مبعوث ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ عالمگیر نبی ہیں، عالمگیر نبی کی موجودگی میں ان کی مثل کسی دوسرے نبی کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے ورنہ آیت ''وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین''(الانبیاء/۱۰۷) کا بطلان لازم آئے گا، اسی لیے آنحضرت کا ایک صفاتی نام ''امی'' بھی ہے جس کا ایک معنی میری دانست میں یہ ہے کہ کرۂ ارض کے مرکز میں رہ کر ساری دنیا کو نور نبوت سے منور کرنا۔(۸)

خواجہ فرید میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر بات کو قرآن کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے مثلاً زمین کے اندر پانی کی سطح کا ایک جگہ پر قائم رہنا، جسے علماء ارضیات 'واٹر ٹیبل' کا نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ زمین کے اندر پانی کی جو سطح بلند ہوتی ہے وہ دراصل بارشی پانی ہوتا ہے، مگر خواجہ فرید نے زمین کے اندر پانی کی سطح بلند ہونے کا سبب پوربی (جنوب مشرقی) ہوا کو قرار دیا ہے (پورب لهاوے پتالوں پانی آوے) (۹) اور اس پر قرآن سے دلیل موجود ہے "وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویسماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر" (ھود/۴۴) اور فرمایا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان (بادل) برسنے سے تھم جا اور پانی خشک ہوگیا اور کام کا فیصلہ ہوگیا۔ یعنی حکم الٰہی پر پہلے زمین نے اپنی پشت پر موجود سارا پانی نگل لیا حالانکہ اس وقت بارش برس رہی تھی، بعد ازاں بادلوں کو برسنے سے رکنے کا حکم ہوا، اگر علماءِ ارضیات کے نظریۂ واٹر ٹیبل (کہ زمین کے اندر پانی کی سطح ایک جگہ پر ہی قائم رہتی ہے) کو سامنے رکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ (باختلاف روایات) چالیس دنوں پر محیط طوفان کا پانی آخر زمین میں کچھ نہ کچھ تو جذب ہوا ہوگا اور زمین میں پانی کی سطح لازماً بلند ہوئی ہوگی، پھر چالیس دنوں کا بے پناہ طوفانی پانی زمین کس طرح نگل گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ زمین کے اندر پانی کی سطح کا بلند یا نیچے ہوجانا موسم اور ہوا کا محتاج ہے، موسم گرما میں جب لو چلتی ہے تو پانی کی سطح نیچے ہوجاتی ہے اور پوربی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو سطح بلند ہوجاتی ہے۔

علامہ سعیدی، خواجہ فرید کے نظریہ کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یہی بات یہ ہے کہ بارش کا پانی مختلف شکلوں میں تقسیم ہوکر مخلوق خدا کے کام آتا ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسی حکمت سے تخلیق فرمایا ہے کہ اس کی سطح میں پانی کو جذب کرنے والی ایکوفرز (Aquifers) ہیں یہ ایکوفرز اگرچہ موٹی تہہ والی ہیں لیکن اپنے اندر پانی کی ایک خاص مقدار ہی جذب کرسکتی ہیں، اس کے نیچے جو دوسری ایکوفرز ہیں وہ اپنے اندر پانی جذب ہی نہیں کرسکتیں، جبکہ پہلی ایکوفرز ایک خاص مقدار جذب کرسکتی ہیں تو نظریہ واٹر ٹیبل قابل بھروسہ نہ رہا، اس کے مقابلے میں خواجہ فرید نے جو کچھ فرمایا ہے، مشاہدہ، تجربہ اور قرآن اس کی تائید کرتا ہے۔(۱۰)

علم نحو کی مشہور کتاب "شرح ملا جامی" میں افعال مقاربہ کی بحث پڑھاتے وقت جب یہ عبارت آئی کہ لفظ "طفق" بھی افعال مقاربہ میں سے ہے، تو خواجہ فرید نے یہ آیت پڑھی

"وطفقا یخصفن علیھما من ورق الجنة" (الاعراف/۲۲) اور وہ دونوں لپیٹنے لگے اپنے جسم پر جنت کے پتے(۱۱) پھر فرمایا کہ:

"حضرت آدم اور بی بی حوا علیہا السلام شجر ممنوعہ چکھنے کے بعد اپنا ستر بہشتی پتوں سے چھپانے لگے، اب سوال یہ ہے کہ شجر ممنوعہ چکھنے کے بعد انہیں اپنا جسم چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ظاہر ہے کہ چکھنے سے مراد زن وشوہر والا تعلق قائم کرنا ہے، ان کی اس لغزش سے ان کا لباس اتر گیا تو انہیں اپنے ستر کو چھپانے کی ضرورت محسوس ہوئی"(۱۲)

یہی بات ایک اور مقام پر مزید وضاحت سے بیان کرتے ہیں، کہ "اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا "ولا تقربا ھذہ الشجرة" (البقرہ/۳۵) اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا۔۔۔۔۔ علمائے ظاہر کا خیال ہے کہ شجرہ سے مراد گندم یا انگور ہے، حالانکہ اس سے مراد بی بی حوا کا جسم ہے، جس طرح شجر سے ثمر پیدا ہوتا ہے اسی طرح عورت کے جسم سے اولاد پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بی بی حوا کو شجرہ اور اس کی اولاد کو ثمر سے تشبیہ دی ہے اور پھر قرآن میں عورت کو کھیتی بھی کہا ہے "نساء کم حرث لکم" (البقرہ/۲۲۳) (تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی ہیں) شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانے کا مطلب زن وشوئی سے بچنا ہے"(۱۳)

خالق کا اپنی مخلوق سے تعلق کے حوالے سے خواجہ فرید نے دوران گفتگو قرآنی آیت "انا عرضنا الامانة علی السمٰوات ..... انه کان ظلوما جهولا" (الاحزاب/۷۲) سے کس طرح ایک سوال کے جواب میں استدلال کیا ہے وہ ملاحظہ ہو، کپتان واحد بخش سیال مترجم اشارات فریدی لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ خواجہ صاحب کی مجلس میں کسی نے دریافت کیا کہ جب وحدت الوجود حق ہے اور ذات حق سے کوئی چیز باہر نہیں تو پھر کیا اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعالیٰ ہر چیز میں اپنی جمیع صفات کمال کے ساتھ موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ذات حق جمیع صفات کے ساتھ ہر چیز میں موجود نہیں، اس وجہ سے کہ ادنیٰ اشیاء میں یہ استعداد نہیں ہے کہ جمیع صفات کمال کی متحمل ہوسکیں، اس لیے شخصیت پرستی یا بت پرستی حرام ہے، نیز چونکہ انسان کا قلب عام اشیاء سے زیادہ استعداد کا مالک ہے اس لیے حق تعالیٰ کی صفات کمال کا کسی حد تک متحمل ہوسکتا ہے، لیکن جملہ صفات کمال کا کلی طور پر ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا، یہ اسی استعداد کی وجہ سے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت یعنی خلافت ارضی کو آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے انکار کردیا اور متحمل ہونے سے اقرار عجز کیا "وحملها الانسان انه کان ظلوما جهولا" (الاحزاب/۷۲) (اور انسان نے وہ امانت قبول کرلی اس وجہ سے کہ وہ ظلومی اور جہولی تھا) فرشتے اس لیے منصب خلافت قبول نہ کرسکے کہ وہ سراپا نور تھے، زمین اور پہاڑ اس لیے قبول نہ کرسکے کہ سراپا ظلمت تھے، لیکن چونکہ حضرت انسان روح اور جسم کا مجموعہ تھا اس کا ایک پہلو نورانی تھا اور ایک ظلمانی، اس وجہ سے وہ ذات حق کی صفات کا عکس قبول کرنے کے لیے مثل آئینہ کی صلاحیت رکھتا تھا انه کان ظلوما جهولا سے مراد یہ نہیں کہ وہ ظالم اور جاہل تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی ایک طرف یا جہت نورانی تھی اور دوسری تاریک، اس لیے وہ آئینہ حق نما بن سکتا تھا یا بن چکا تھا۔۔۔۔۔ نیز آیت مذکورہ کے سیاق وسباق پر غور کیا جائے تو کلمات ظلوماً جهولاً ستائشی ہیں نہ کہ الزامی(۱۴)

خواجہ فرید نے اسی آیت کی ایک اور تشریح بھی کی ہے جو مذکور تشریح سے مختلف ہے چنانچہ علامہ سعیدی لکھتے ہیں، خواجہ فرید نے اس آیت کا دوسرا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔۔ امانت سے مراد وہی امانت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بتائی گئی ہے، "انا عرضنا الامانة

علی السموٰت والارض ... انه کان ظلوما جهولا" (الاحزاب/۷۲) یعنی امانت دینے سے مراد مرتبۂ جامعیت ہے اور یہ اشارہ ہے ربوبیت، مربوبیت، حقیقت، خلقیت جیسی صفات کی طرف، آسمانوں سے مراد عالم علوی یا فرشتے ہیں، زمین سے مراد عالم سفلی اور جبال سے مراد وہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے (یعنی نفسانی کرے) مگر تمام علوی وسفلی عالمین نے اس امانت کو سنبھالنے، قبول کرنے سے انکار کردیا، کیونکہ ان میں اس امانت کو سنبھالنے کی قوت وہمت نہیں تھی، اس لیے اس بھاری بوجھ کو اٹھانے سے زمینی، آسمانی اور جبالی مظاہر ڈر گئے، لیکن انسان کہ جس کی فطرت میں اس امانت کو اٹھانے کی صلاحیت اور طاقت تھی اس نے یہ امانت اٹھائی، تبھی فرمایا گیا کہ انسان ظلومی ہے یعنی اپنی جان کو مجاہدے اور ریاضت سے چور چور کرنے والا، اپنی ذات وصفات کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں فنا کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو بھلانے والا ہے، مطلب یہ کہ انسان آئینے کی طرح ہے اس کا ایک پہلو نور اور دوسرا پہلو ظلمت ہے، انسان میں نور وظلمت کے اجتماع کے سبب اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے عکس کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی، اسی صلاحیت ولیاقت کو ظلوما جهولا کہا گیا ہے(۱۵)

یہ تو معلوم ہے کہ ۵ جلدوں پر مشتمل "اشارات فریدی" آپ کے ملفوظات ہیں اور یہ بھی کہ مجلس میں ہر نوع کے سوالات کیے جاتے تھے اور آپ کے جواب کی ابتداء قرآنی آیت، حدیث یا دینی حوالے پر ہوتی تھی، ایک دفعہ موسلا دھار برستی بارش کے دوران بارش پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص مقدار کی بارش برساتا ہے اور پھر سورۂ مؤمنون کی ایک آیت کا یہ حصہ پڑھا "وانزلنا من السماء ماءً بقدر فاسکنّٰه فی الارض" (المؤمنون/۱۸) (اور ہم آسمان سے ایک خاص مقدار میں پانی برساتے ہیں اور اسے زمین میں ٹھہرادیتے ہیں) پھر فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بارش کے سارے پانی کو جذب نہیں کرتی بلکہ ایک خاص مقدار کو جذب کرتی ہے، باقی پانی زمین پر انسان کی ضروریات کے لیے زمین کی سطح پر ندی نالوں، دریاؤں نہروں، جھیلوں، جوہڑوں اور ٹوبھوں (تالابوں) میں تقسیم ہوجاتا ہے جس سے انسان مختلف نوعیتوں میں فائدہ اٹھاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ زمین کی پشت پر انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کے لیے پانی کو ذخیرہ کردیتا ہے جس کی تائید اس آیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہوتی ہے "وانزلنا من السماء ماءً فاسقینکموہ وما انتم لہ بخزنین" (الحجر/۲۲) (پس ہم ہی برساتے ہیں آسمان سے پانی اور ہم ہی پلاتے ہیں تمہیں اس کا پانی، اور تم تو اسے جمع کرکے نہیں رکھتے) (۱۶)

خواجہ فرید کے استحضار علمی اور نکتہ آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ محفل میں بغیر کسی سابقہ تیاری اور بغیر کسی مطالعہ کے (حالانکہ نوابان بہاولپور کی عظیم لائبریری کے بعد آپ خود بہت بڑی ذاتی لائبریری کے مالک تھے) علماء وفضلاء کی موجودگی میں مختلف عنوانات پر فی البدیہہ گفتگو کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا مطالعہ دین ومذہب، تصوف، انساب، تقابل ادیان، تاریخ، جغرافیہ، حیاتیات اور فلکیات میں بہت گہرا تھا اور ساتھ ہی استنباط اور نتیجے کے استخراج میں بھی کمال کی قدرت رکھتے تھے، طرہ یہ کہ وہ مدبرانہ فکر کے حامل تھے، اس لیے بعض معاملات میں ان کا تدبّر اور ان کی نکتہ بینی اظہر من الشمس ہے، مثال کے طور پر مشکوٰۃ شریف پڑھاتے وقت جب ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے راس الکفر محو المشرق (کفر کا سر مشرق کی جانب ہے) تو فرمایا کہ "محو المشرق" سے مراد قوم ترکان تاتار ہے جس کے سردار چنگیز خان اور ہلاکو خان تھے، ترکانوں کے یہ تمام قبائل کافر تھے جو یاجوج وماجوج کے نام سے موسوم تھے یہ لوگ ملک تاتارچین سے آئے تھے جو عرب شریف کے مشرق میں ہے نیز کرۂ ارض کا انتہائی مشرقی حصہ ہے اس لیے محو المشرق سے اسی کی طرف اشارہ ہے، انہوں نے خراسان، ایران اور بغداد پر قبضہ کیا اور تباہ وبرباد کرڈالا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے پیشگوئی فرمائی کہ سر مشرق میں ہے (۱۷)

اسی طرح ایک مرتبہ مشکوٰۃ شریف پڑھاتے وقت عبدالرحمٰن بن سلیمان سے مروی یہ روایت آئی کہ "قریب ہے کہ عجم سے ایک بادشاہ آئے گا اور تمام ممالک پر قبضہ کرکے مسلط ہوجائے گا، مگر ایک شہر دمشق اس کے تصرف میں نہیں آئے گا اور وہ اس پر غالب نہیں ہوسکے گا" تو حدیث کی بابت فرمایا یہ حدیث صریحاً چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کے حق میں ہے جو کافر، جابر اور مسلمانوں کا دشمن تھا، اس نے ماوراء النہر، سمرقند، بخارا، غزنی، بغداد وغیرہ کو ظلم وستم سے تاراج کیا، پھر اسی ہلاکو کا بیٹا مسلمان ہوا اور سلطان احمد کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے بھتیجے کا

بیٹا سلطان ابوسعید بہت ہی عادل بادشاہ تھا، روم سے دریائے جیحون تک اس کی سلطنت تھی اور خطبے میں اس کا نام پڑھاجاتا تھا، جب کہ چنگیز خان اپنے آپ کو پیغمبر کہتا تھا، چونکہ وہ اسلام دشمن تھا اس نے بیشمار مسلمانوں کو شہید کیا اور یہی کچھ ہلاکو نے کیا۔ ملخصاً (۱۸)

خواجہ فرید کی شہرت روز بروز ارتقاء پذیر ہے، انہوں نے مرکزی شہروں سے دور ایک پسماندہ علاقے میں رہتے ہوئے شہرت کی اوج ثریا پر کمند ڈالی، جبکہ ان کے چاروں طرف نابغہ روزگار شخصیات کے مراقد اور مسندیں موجود تھیں، جیسے بابا فرید گنج شکرؒ، قبلۂ عالم کے نام سے مشہور خواجہ نور محمد مہارویؒ (چشتیاں) خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ، حکم الدین سیلانیؒ، چنن پیرؒ، شیخ عبدالستارؒ، حضرت مجروحؒ، چھٹہ بھٹہؒ، شاہ رکن عالمؒ، بہاؤالدین زکریاؒ، حافظ جمال اللہ ملتانیؒ، عبدالعزیز پرہارویؒ، شاہ سلیمان تونسویؒ، نور محمد نارووالہؒ (حاجی پور) متو مبارکؒ اور سخی سرورؒ اور مشائخ اوچ شریف وغیرہ، ان مرجع خلائق مراکز کے درمیان میں سے خواجہ غلام فرید کا ابھر کر سامنے آنا اور شہرت کے افق پر چھاجانا یہ معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب ان کے علم وفضل کا کمال ہے۔

کپتان واحد بخش سیال مترجم اشارات فریدی لکھتے ہیں: "خواجہ غلام فرید کے تبحر علمی اور شان معرفت کا یہ عالم تھا کہ دور دراز علاقوں سے علماء اور فضلاء اور درویش حاضر ہوکر ادق مسائل دریافت کرتے تھے"

صاحب ہفت اقطاب مولانا غلام جہانیاں معینی لکھتے ہیں کہ: "بحر العلوم حضرت مولانا شاکر محمد ڈیروی اپنے وقت کے بے نظیر اور جلیل القدر علماء میں سے تھے، چند ماہ حضور (خواجہ فرید) کی خدمت اقدس میں بغرض استفادہ وحصول فیوض رہے ایک عرصہ بعد کسی دوست نے حضرت مولانا سے دریافت کیا کہ اس عرصہ میں آپ نے کیا کچھ حاصل کیا ہے؟ تو حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا کہ ابھی تک تو لاالہ الا اللہ کا معنی پورا نہیں ہوا" (۱۹)

اسی طرح اپنے عہد کے شمس بازغہ اہل علم دیوان ولایت علی شاہ اوچ بخاری، دیوان خیر شاہ، حیدر بخش اور دیگر باکمال علماء وصوفیاء آپ کے تلمیذ ومرید تھے، حضرت مولانا محمد مسلم علی پوری جو وقت کے جید عالم تھے جن کی خدمت میں کثیر التعداد طلباء دورۂ حدیث وتفسیر وکتب

© rasailojaraid.com

معقول پڑھتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ ''جب خواجہ فرید نے مجھے لاالہ الااللہ کا معنی سمجھایا تو میں نے خود کو ان کے سامنے طفل مکتب پایا'' اسی طرح کثیر التعداد امراء ورؤساء اور والیان ریاست بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے، نواب صادق محمد خاں رابع والی ریاست بہاولپور، نواب قیصر خان مگسی والی ریاست جھل مگسی (بلوچستان) نواب محمد اکبر خان بگٹی کے والد، ریاست ٹونک کے نواب عبد العلیم خان، اٹک (ڈیرہ اسماعیل خان) کے سردار کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے شہزادہ احمد اختر بھی خواجہ فرید کے مرید تھے۔ ملخصاً(۲۰)

خواجہ فرید کے ملفوظات ''اشارات فریدی'' کی اہمیت کی سات وجوہات مترجم الحاج کپتان واحد بخش سیال نے مقدمہ میں تحریر فرمائی ہیں اور ہم صرف پہلی وجہ نقل کرکے اس مضمون کو ختم کر رہے ہیں:

> ''اشارات فریدی کی اہمیت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ عہد حاضر کے نظریہ لادینیت (secularism) اور مادہ پرستی (Materialism) کے طوفان نے تمام مذاہب کی روحانی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ختم کرکے ساری دنیا میں جس بہیمیت کا دور قائم کردیا ہے، اس کے قلع قمع کے لیے روحانیت اسلام سے زیادہ مؤثر ہتھیار کوئی اور طاقت نہیں ہے، چونکہ اشارات فریدی عصر حاضر کے ایک ایسے متبحر عالم، ولی کامل کے ارشادات کا مجموعہ ہے جو علوم قدیم وجدید میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ عصر حاضر کے تمام مسائل ومعاملات سے بھی بخوبی آگاہ تھے، آپ کے یہ روحانیت سے لبریز اور علمی شاہکار ملفوظات تہذیب مغرب کے تمام زہر آلود نظریات کے لیے تریاق کا اثر رکھتے ہیں''(۲۱)

خواجہ غلام فرید کا وصال ۷ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء کو ہوا، آپ کا مدفن کوٹ مٹھن شریف میں مرجع خلائق ہے۔(۲۲)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مقالات اقبال جلد ۲، ص ۲۰۲، مطبوعہ الفیصل ناشران وتاجران، کتب اردو بازار، لاہور سن ندارد

۲۔ مقالات اقبال جلد ۲، ص ۳۴۶، مطبوعہ الفیصل ناشران وتاجران، کتب اردو بازار، لاہور سن ندارد

۳۔ مقالات اقبال جلد ۲، ص ۸۹۱۔۸۸۸، مطبوعہ الفیصل ناشران وتاجران، کتب اردو بازار، لاہور سن ندارد

۴۔ حالوت، علامہ نسیم، مقدمہ دیوان فرید ص ۸، مطبوعہ صادق الاخبار پریس، بہاولپور سن ۱۹۴۳ء

۵۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنس پر کوپر چول ص ۳۴، مطبوعہ سرائیکی ادبی سنگت کراچی ۲۰۰۹ء

۶۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنس پر کوپر چول ص ۳۸، مطبوعہ سرائیکی ادبی سنگت کراچی ۲۰۰۹ء

۷۔ عزیز الرحمن، مولانا، شارح دیوان فرید، پیش لفظ ص ۱، مطبوعہ مذکور ۱۹۴۳ء

۸۔ مقالات اقبال جلد ۳، ص ۵۳۲ تا ۵۳۹، مطبوعہ مذکور، اس موضوع پر تفصیل کے لیے راقم کا مضمون بعنوان ''الامی کے معنی کی تحقیق اور اس کے اطلاقات'' ملاحظہ کیجیے جو سہ ماہی التفسیر، کراچی میں جلد ۲ شمارہ ۴ (2005ء) کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

۹۔ دیوان فرید سرائیکی کافی نمبر ۱۸۷، مطبوعہ مذکور ۱۹۴۳ء

۱۰۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید سائنس پر کوپر چول ص ۷۱۔۷۰، مطبوعہ مذکور ۲۰۰۹ء

۱۱۔ سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۲　　۱۲۔ مقالات اقبال، جلد ۵، ص ۱۰۵۶، مطبوعہ مذکور

۱۳۔ مقالات اقبال، جلد ۲، ص ۹۱۸، مطبوعہ مذکور، علامہ رحمت اللہ طارق نے اسی موضوع پر ایک مدلل مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا عنوان ہے ''الشجرہ'' سے نسوانی جسم کا مقام خاص مراد ہے۔ ملاحظہ کیجیے تفسیر برہان القرآن ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۷، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان۔

۱۴۔ سیال، واحد بخش، کپتان، مقدمہ مقالات اقبال، ص ۳۰۔۳۱۹، مطبوعہ مذکور

۱۵۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید سائنس پر کوپر چول ص ۶۵۔۶۳، مطبوعہ مذکور، اس آیت کی تشریح علمائے کرام نے مختلف انداز میں کی ہے خواجہ غلام فرید کی تشریح بھی عام مفسرین سے اس لیے مختلف ہے۔ بہر حال اس آیت پر مفسرین کرام کی تشریحات کے ساتھ ایسے محاکمانہ تجزیہ کی ضرورت ہے جو تحقیقی اسلوب کا حامل ہو، اور راقم کے لیے سر دست یہ ناممکن ہے۔ ہاں مستقبل میں ضرور ممکن العمل ہے۔ (ان شاء اللہ)

۱۶۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید سائنس پر کوپر چول ص ۷۲ او ۷۱، مطبوعہ مذکور

۱۷۔ مقالات اقبال جلد ۵، ص ۱۳۱، مطبوعہ مذکور　　۱۸۔ مقالات اقبال جلد ۵، ص ۶۲۵۔۶۲۲، مطبوعہ مذکور

۱۹۔ محمد سیال، واحد بخش، کپتان، مقدمہ مقالات اقبال، ص ۷۷، مطبوعہ مذکور

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۷　　۲۱۔ ایضاً، ص ۹۰، مطبوعہ مذکور

۲۲۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنس پر کوپر چول ص ۱۳، مطبوعہ مذکور

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

اقبال کا علمِ کلام اور اس کی نوعیت

ڈاکٹر محمد آصف

Allama Iqbal, in actual, is a Schoolman / Scholastic. The modern Scholasticism that was founded by Sir Syed and that was propagated by Shibli and Syed Amir Ali, Iqbal not only complemented it but also stablised its growth. He made religion and science embrace each other. He uprooted skepticism in philosophy and vindicated the believes and theories of Islam in the light of modern knowledge and arts. In this way he gave a genesis to Islamic thought. This is the achievement of Iqbal that he motivated the centuries old scholasticism by harmonizing it with scientific era. He purified it from the passiveness of non-Arabic mysticism and Greek thoughts. He guided us towards the concept of collective self and modernism in Pakistan.

فلسفہ اور علمِ کلام دونوں "مربوط"، "مدلل" اور "منطقی و عقلی" نظامِ فکر کو پیش کرتے ہیں اور دونوں کا مقصد ایک قابلِ عمل نظامِ حیات کو پیش کرنا ہے تاہم دونوں میں ایک نازک مگر ایک پیچیدہ سا فرق پایا جاتا ہے اور یہی فرق دونوں کی حدوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ فلسفہ تمام تر عقائد و نظریات اور مذہبی جکڑ بندیوں سے آزاد غور و فکر کا نام ہے۔ یہ آزادی سے کسی نظریے یا نتیجے تک پہنچتا ہے اور اس نتیجے میں شک و شبہ اس کا وصف ہے یعنی پہلے آزادی سے تدبر و تفکر کرنا اور پھر کسی نتیجے تک پہنچنا اس کی خصوصیت ہے۔ بقول علی عباس جلال پوری "فلسفہ ایک مستقل آزاد اور مسلسل ذہنی کاوش کا نام ہے جسے کسی مخصوص عقیدے کی حدود میں مقید نہیں کیا جاسکتا"(۱) جبکہ علمِ کلام میں مخصوص عقائد و نظریات کی روشنی میں کائنات کی توجیہہ عقل واستدلال کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ شک کی بجائے یقین اور آزادی کی بجائے پابندی اس کا وصف ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> "علمِ کلام اس علم کا نام ہے جس میں اسلامی عقائد (یا مخصوص مذہبی عقائد) کو دلائلِ عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔"(۲)

آزادی و شک، یقین و پابندی کا فرق علی عباس جلال پوری نے بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے:

> "علمِ کلام کیا ہے؟ پہلے عقیدہ رکھنا پھر غور و فکر کرنا۔ جو شخص آزادانہ غور و فکر کرنے کے بعد کوئی عقیدہ اختیار کرے گا وہ متکلم نہیں رہے گا فلسفی کہلائے گا۔"(۳)

سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ فلسفہ کا دورِ زریں کہلاتا ہے۔ ان جید یونانی فلاسفہ نے اپنے نظریات و افکار سے تہذیب و تمدن میں نئی روح پھونکی اور حقیقت یہ ہے کہ علم و ادب، سیاست و عمرانیات، تاریخ و مذہب میں انہیں کے نظریات نے نت نئی تحریکوں کی شکلیں اختیار کیں۔ اسی دوران ایسے مکتبہ ہائے خیال نے بھی جنم لیا جن کی آزادہ روی اور تشکیک نے مدتوں عقائد کو شکست و ریخت سے دوچار کیا۔ اسی کو فلسفہ کہا گیا۔ گویا فلسفہ شک و شبہ کی کوکھ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنم لیتا ہے۔ مذہب اور عقائد کے ایقان و برہان کے بغیر یہ نشو ونما پاتا ہے۔

علم کلام نے فلسفے کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس کا احسان یہ ہے کہ اس نے یونانی اثرات سے مسلم فکر کو نجات دلائی۔ فلسفہ کی تشکیک کا خاتمہ کر کے مذہب کی حقانیت کو عقل سے ثابت کیا۔ (۴) چنانچہ ابوالبرکات، امام رازی، امام غزالی، علامہ آمدی، ابن تیمیہ، اسی طرح فارسی شعراء مثلاً رومی، سنائی، عطار، حافظ، صائب، عرفی، حافظ وغیرہ نے اپنے عقائد ونظریات کے تحت اسلامی فکر کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔ ان میں رومی، غزالی اور رازی نے محض عقل کی بجائے عملی نتائج سے اسلامی فکر کا اثبات کیا(۵)

علم کلام اور فلسفے کی تاریخ میں عباسی دور بے حد اہمیت کا حامل ہے۔اس دور میں ایک طرف ایرانی اور یونانی فلسفے عربی میں منتقل ہوئے تو دوسری طرف مغربی اقوام سے تہذیبی و ثقافتی رشتے بھی استوار ہوئے۔ جس کے نتیجے میں بے شار علمی سوالات نے جنم لیا، عقائد و ایمان کی عمارتوں میں دراڑیں پڑنے لگیں اس کے ساتھ ہی مغربی اقوام اور مستشرقین نے فلسفے کے ذریعے اسلام کی بنیادوں کو اکھیڑنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ''فلسفے کے ذریعے ہی فلسفے کا رد کریں۔ اس فکری اور ذہنی آویزش نے ابو مسلم، ابوبکر، ابوالقاسم اور اسی طرح کے دوسرے متعدد علماء کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے مغربی خیالات و افکار کے بطلان کے لیے قرآن کی تفاسیر کے علاوہ دیگر ایسی کتب پیش کیں جنہوں نے ''ایک جدید علم کلام سے پہلی مرتبہ ساری دنیا کو آشنا کیا'' چنانچہ رازی، غزالی، ابن رشد، قاضی عضد یہ سب اسی رجحان عقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فلسفے کا یہ جدید انداز یعنی علم کلام تیزی سے مصر، شام، ترکی اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اسے فلسفے سے علیحدہ ایک علم یعنی علم کلام تصور کیا جانے لگا اور اس میں اتنی تیزی سے ترقی وتوسیع ہوئی کہ ''یونانی و ایرانی فلسفہ کا آہنی قلعہ ذرا سی جنبش سے مسمار ہوگیا۔''(۶)

مغربی علوم وفنون، نظریات اور تہذیب وثقافت کے عمل دخل کی بدولت ہندوستان میں جس قدیم وجدید کی آویزش نے جنم لیا اس میں جدید علم کلام کی ضرورت و اہمیت کا

احساس سب سے پہلے سرسید نے کیا۔ یہی احساس تھا جس نے ان سے خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن اور تبیین الکلام جیسی تالیفات تصنیف کرائیں۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان عقائدِ مذہبی، تاریخ اسلام اور اسلام کے شیوخ سے بھی آگاہ ہوں اور مغربی علوم سے بھی۔ دوسرے لفظوں میں سرسید اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ اور ترقی کے لیے مذہب اور سائنس کا ملاپ کرا کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا تھا:

> ''اس زمانے میں ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کردیں یا مشتبہ ٹھہرادیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں کہ اس زمانے میں صرف یہی صورت حمایت اور حفاظتِ اسلام کی ہے۔''(۷)

اس کے تحت ''سرسید نے اسلام کی ایسی ترجمانی کی جس پر عمل، سمجھ اور جدید فلسفے کی رُو سے کوئی اعتراض نہ ہوسکے۔''(۸)

غرض سرسید نے جدید علوم وفنون، اسلام کی نئی تعبیر وتشریح، محنت وعمل، عقلیت و نطرت، اجتہاد، روشن خیالی اور علیحدہ قومیت پر مبنی خیالات پیش کیے اور ان کو عملی جامہ پہنایا۔ ان کی اصلاحی کوششیں تعلیمی، سیاسی، مذہبی امور تک محدود نہ تھیں بلکہ انہوں نے اردو ادب کو بھی اجتماعی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے علمی افکار کی اشاعت کا ذریعہ بنایا اور اسے بھی عقلیت ونطرت اور افادیت کی بنیادوں پر استوار کیا۔ یہاں تک کہ خود اقبال نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ ''سرسید پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔''(۹)

جدید علم کلام کو فروغ دینے میں جن لوگوں نے سرسید کا ساتھ دیا ان میں مولوی چراغ علی، شبلی، سید امیر علی، مولوی نذیر احمد اور حالی پیش پیش تھے (علم کلام کے حوالے سے ان میں بالخصوص شبلی اور سید امیر علی)۔ سرسید کی انتہا پسندی کے برعکس شبلی پرانی روشنی کو نئی روشنی میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مشرق ومغرب دونوں سے مرعوب ہوئے بغیر اور اندھی تقلید کے

© rasailojaraid.com